© rasailojaraid.com

روشن خیالی اور رواداری
ایک تاریخی جائزہ

محمد صدیق شاہ بخاری

لفظ ''رواداری'' افراد واقوام کے لیے اسی طرح جانا پہنچا ہے جس طرح مٹی، پانی، آگ، ہوا۔ مگر اس لفظ کے استعمال پر انسان اسی طرح جھگڑتا ہے جس طرح زن، زر اور زمین پر۔ اس لفظ کے ثمرات کا حصول اگر چہ ہر انسان کا مقصود ہے مگر جب اپنے مفاد پہ زد پڑتی نظر آئے تو ہر شخص اس کو اسی طرح بھول جاتا ہے جس طرح باز اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے سب کچھ بھول جائے۔ خود کو اس صفت کا حامل کہلانا ہر فرد اسی طرح اپنا حق سمجھتا ہے جس طرح امریکا خود کو امن پسند اور دوسروں کو دہشت گرد کہنا اپنا حق جانتا ہے۔

رواداری، اگر چہ اعلیٰ انسانی اقدار کا جز و اعظم ہے مگر بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح بلی کا چوہے کے لیے روادار ہونا خلاف فطرت ہے، اسی طرح ہر انسان کا دوسرے انسان اور ہر قوم کا دوسری قوم کے لیے ہر وقت، ہر موقع اور ہمیشہ کے لیے روادار ہونا بھی نظام قدرت کے خلاف ہے۔ جس طرح اس کائنات میں کسی بھی خلاف فطرت بات کو دوام حاصل نہیں، اسی طرح تاریخ اقوام عالم کا مطالعہ اس امر کا شاہد ہے کہ عملی طور پر اس ''غیر ضروری رواداری'' کے نظریہ کو بھی کبھی استقرار حاصل نہیں رہا۔

تمام تر انسانی اقدار کا ایک مطلوبہ معیار ہی مطلوب ومحبوب ہوتا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ کی صورت میں وہی قدر، ایک خوفناک ومکروہ شکل اختیار کر لیتی ہے، جیسے قوت غضبیہ کی پسندیدہ مقدار شجاعت کہلاتی ہے، اس میں تفریط بزدلی تو افراط جاہلیت ہے۔ قوت عقلیہ کی مناسب سطح حکمت ودانائی ہے، کمی کی صورت میں حماقت اور زیادتی جزبرہ ہوتی ہے۔ قوت شہوانیہ کی معتدل حد عفت وعصمت ہے، جب کہ کمی جمود اور اضافہ فسق وفجور ہے۔ بعینہ رواداری حد سے بڑھ جائے تو بے غیرتی وبزدلی بن جاتی ہے اور ضرورت سے بھی کم ہو جائے تو تعصب وتنگ نظری سمجھی جاتی ہے۔

شومئی قسمت سے آج کا مسلم معاشرہ غیرت کی کمی اور رواداری کے اضافہ کا بری طرح شکار ہو چکا ہے۔ اس میں جہاں پس پردہ غیروں کی گہری اور منظم سازش کارفرما ہے، وہاں اپنوں کی سادگی، بھولپن، بلکہ نادانی وحماقت کا بھی کچھ کم دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں امت مسلمہ تحقیر وتذلیل کی اتاہ گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔ وہی امت کہ ''تھی جس کی فلک سوز کبھی آواز'' آج عالم یہ ہے کہ [illegible] کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا کیوں نہ ہو؟ ہم نے تو اسی باطل کو اپنے ''کاشانہ دل کا مکین'' بنا لیا کہ ''تیرے آباء کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے'' وہی لوگ جو ہمارے اسلاف کے در پہ کاسہ گدائی لیے پڑے رہتے تھے، آج ہمارے ان داتا بنے بیٹھے ہیں۔

جس کو ہم نے آشنا لطف تکلم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے، ان کی خود داری بھی دیکھ

پہاڑوں کی چٹانوں میں نشیمن بنانے والے آج تنگ وتاریک گھاٹیوں کے مکیں کیوں کر ہو گئے اور صحرا کی وسعتوں کو اپنے قدموں تلے روندنے والے آج بند گلیوں کے باسی کیوں کر بن گئے؟ یہ کوئی چند روز کا قصہ نہیں، اس کے پیچھے اغیار نے برسوں نہیں، صدیوں محنت کی ہے اور امت کی رگوں سے غیرت کا جوہر ختم کرنے کے لیے اس کو غیر ضروری رواداری کا زہر ہلاہل قند کی شکل میں کھلاتے رہے ہیں اور اب انہیں کھلانے کی ضرورت بھی نہ رہی کہ یہ ''قند'' امت کے منہ کو لگ گیا، اب یہ خود ہی اسے وافر مقدار میں تیار کر لیتی ہے۔ بے کار اور بلا ضرورت روا داری کا تصور سمجھنا ہو تو ایک لمحہ کو ان اشعار پہ غور فرمایئے:

تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے
تم دین کہو وہ دھرم کہیں منشا تو اسی کی راہ سے ہے
تم پریم کہو وہ عشق کہیں مطلب تو اسی کی چاہ سے ہے
وہ جوگی ہیں تم سالک ہو مقصود دل آگاہ سے ہے
کیوں لڑتا ہے مورکھ بندے تیری خام خیالی ہے
ہے پیڑ کی جڑ تو ایک وہی یہ مذہب ایک اک ڈالی ہے
تکبیر کا جو کچھ مطلب ہے ناقوس کا بھی منشا ہے وہی
تم جن کو نمازیں کہتے ہو ہندو کے لیے پوجا ہے وہی

ذرا دل تھام کے بتایئے گا کہ کیا اس تصور کے بعد اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے احکامات، جہاد کا پورا تصور: ﴿ان الدین عنداللہ الاسلام﴾ ﴿ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ﴾ ﴿ولا تموتن الا وانتم مسلمون﴾ کا قرآنی نظریہ اور ﴿الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا﴾ کا اعلان ربانی بے معنی ہو کر نہیں رہ جاتا؟ بلکہ بعثت انبیا، نزول وحی، اخروی کامیابی اور جزو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سزا کا سارا نظریہ بھی فضول اور اضافی ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر جب ہر راہ ہی اسی ایک سمت جاتی ہو تو پھر باطل، باطل نہ رہا، حق و باطل، سچ و جھوٹ، اچھا و برا، نیک و بد، گھوڑا اور گدھا سب برابر سمجھے جانے چاہییں۔

رواداری کا یہی وہ تصور ہے جسے ہم ''فتنہ رواداری'' سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمانانِ برصغیر میں اس ''فتنہ رواداری'' کا بھرپور آغاز اکبر کے ''دینِ الٰہی'' سے ہوتا ہے، جس کے اہم اجزائے ترکیبی کچھ یوں تھے:

''گائے کا گوشت حرام قرار دیا گیا، ہندو تہوار ہولی، دیوالی، دسہرہ پورے ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ سود و جوا، شراب نوشی حلال قرار پائے۔ خنزیر مقدس جانور سمجھا جانے لگا۔ لاشوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا بہتر قرار پایا اور اگر دفن کیا جاتا تو اس کے پاؤں لازمی طور پر قبلے کی طرف کیے جاتے۔ اکبر خود بھی خانہ کعبہ کی طرف پاؤں کر کے سوتا تھا۔ چچازاد اور ماموں زاد سے نکاح ممنوع ٹھہرا۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا تعزیری جرم قرار پایا۔ منطق، فلسفہ، تاریخ اور ریاضی جیسے مضامین کی تدریس پر زور دیا گیا۔ فقہ، حدیث و تفسیر حقیر خیال کیے جانے لگے۔ زبان سے عربی الفاظ خارج کرنے کی مہم شروع ہوگئی۔ چالیس اہل علم کی مجلس بنائی گئی جو ہر مذہب سے اچھی باتیں اخذ کر کے نیا مذہب تشکیل دینے لگی مگر اس مجلس میں اگر کوئی عالم اسلام کی بات کرتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ کلمہ توحید بدل کر ''محمد رسول اللہ'' کی جگہ ''اکبر خلیفۃ اللہ'' تجویز کیا گیا اور اکبر کے سامنے سجدہ لازمی قرار پایا۔ (روداد قفس، از سید گیلانی، جلد اول، ص:273)

اکبر کے اس خود ساختہ مذہب کا اگر بنظر غائر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ اس مذہب کی ابتدا بھی ہندوؤں کے ساتھ غیر ضروری رواداری کے اس بیج سے ہوئی جو اس کے ذہن میں کوتاہ اندیشوں، جاہ طلب اسلام دشمنوں، سازشی عناصر اور علمائے سوء نے بویا تھا اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جب یہ بیج پھوٹ کر باہر نکلے گا تو اس سے رواداری کا وہ شجر سایہ دار بنے گا جس کے سایہ امن و محبت تلے پورے معاشرے کو سکون نصیب ہوگا۔ مگر تاریخ نے دیکھا کہ اس بیج سے شجر تو نکلا جس کا نام بھی اگرچہ رواداری ہی تھا مگر اس پہ الحاد کے پتے پھوٹے، شرک و بت پرستی کے کانٹے نکلے اور اس پہ ہندو ازم کے پھول لگے اور ایسے میں اگر حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ جیسے محسن ملت اس فتنہ رواداری کی جڑوں پہ اسلامی غیرت و حمیت کا کلہاڑا نہ چلاتے تو آج شاید برصغیر میں مسلمانوں کی تصویر کچھ اور ہوتی۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مجددؒ کے نفس گرم کی برکت سے اگر چہ امت کا سوادِ اعظم ہمیشہ کے لیے اس فتنہ رواداری سے محفوظ ہو گیا مگر اندرون خانہ ایک قلیل گروہ پھر بھی اس کا پرچارک رہا اور آنے والی صدیوں میں کسی نہ کسی شکل میں اس راہ پہ گامزن رہا۔ اکبر کے بعد اس گمراہی کو ایک بڑا سہارا داراشکوہ کی صورت میں میسر آیا۔ جس نے ایک کتاب ''مجمع البحرین'' کے نام سے لکھی، جس کی وجہ تالیف کے بارہ میں داراشکوہ خود لکھتا ہے کہ ''مجھے لفظی تفاوت کے علاوہ ان کے (یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں) حقائق شناسی کے راستے اور طرز میں کوئی ممیز فرق نظر نہیں آیا۔ اس لیے دونوں فریقوں کے خیالات کو یکجا کر کے اور دونوں کے نکات کو جمع کر کے جن کا علم حق کے ایکحلاشی کے لیے نہایت ضروری اور فائدہ مند ہے۔ میں نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور اس کا نام ''مجمع البحرین'' رکھا ہے کیوں کہ یہ دونوں فرقوں کے حق شناسوں کی دانش مندی اور سچائی کا مجموعہ ہے۔''

(بحوالہ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، از ڈاکٹر محمد عمر، ص:35)

داراشکوہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے مسلمان بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے ہندو بیراگیوں اور جوگیوں کی صحبت اختیار کر لی۔ جیسا کہ عبدالغنی بیگ قبول کشمیری جو کہ محمد شاہ کے عہد میں تھا۔ اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ خود کو کسی ہندو کا مرید کہتا تھا۔ ''دبستان مذاہب'' میں لکھا ہے کہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی ان کے مذہب میں آنا چاہتا ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور مانع نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان بھی بشن کی پرستش کرتے ہیں کیوں کہ بسم اللہ کے یہی معنی ہیں، یعنی بشن کو بسم اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عارف سبحانی نامی درویش مسجد اور مندر دونوں کی برابر تعظیم کرتے تھے اور مندر میں ہندوؤں کے آئین کے مطابق پوجا اور ڈنڈوت کے مراسم ادا کرتے اور مسجد میں مسلمانوں کی طرح نماز بھی پڑھتے تھے۔ محمد شاہ صوفیوں اور بیراگیوں سے مصاحبت رکھتا تھا۔ آخر میں وہ سوامی نرائن سنگھ کا مرید ہو گیا۔ بھگوان داس ہندی نے مرزا گرامی کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے وسیع المشربی (یعنی غیر ضروری رواداری) کا شیوہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کا ظاہری لباس صوفیا اور مشائخ کے مشابہ تھا، لیکن ہندوستان کے قلندروں کی وضع میں زندگی گزارتے تھے۔ داڑھی اور بھنوؤں کو خیر باد کہا اور ہر مذہب وملت کے لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے۔'' (ماخوذ از ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:36 تا 40)

داراشکوہ کے قتل، اورنگ زیب عالم گیر کی تخت نشینی سے اگر چہ اس فتنہ رواداری کو بھرپور دھچکا لگا مگر پھر بھی یہ مکمل طور پر فرو نہ ہو سکا۔ بہت سے نام نہاد دانش ور، صوفی اور شاعر اس کی جڑوں میں پانی دینے میں مصروف رہے، مثلاً جوشش نے کہا:

چشم وحدت سے گر کوئی دیکھے
بت پرستی بھی حق پرستی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کفر واسلام کی نہ کر تکرار
دونوں یکساں ہیں چشم بینا میں
کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بول
یہ دونوں ایک ہیں آپس میں ان کے بیچ رشتہ ہے

(تذکرہ گلشن ہند، ص:55)

دیر وکعبہ پر ہی کیا موقوف شیخ و برہمن
کون سی جا ہے جہاں جلوہ نہیں اللہ کا

(تذکرہ گلشن ہند، ص237)

وفا داری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مَرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(غالب)

اس نظریہ کی وضاحت مرزا صدرالدین اصفہانی نے لالہ مکتا پرشاد سے کچھ یوں کی: ''جناب والا کو یہ بات معلوم ہے کہ میرا مذہب صوفیانہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندو میں کیا برائی ہے اور مسلمان میں کیا اچھائی؟ دونوں خدا کے بندے اور عارف کے نور چشم ہیں۔''

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اس قسم کے صوفیا عام مسلمان اور شاعر بھی ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ بالخصوص رام چندر جی اور کرشن بھگوان کو تو انبیا کا درجہ دیتے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے اپنی ایک نظم میں رام چندر جی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنی نظموں میں کرشن جی بھگوان اور شیو جی کی بھگتی کے گیت گائے ہیں۔

فکر ونظر کی اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں ہندوؤں میں بھی موجود تھیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں کی گہری، عیارانہ اور مکارانہ سازشوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں وسیع المشربی کی یہ آکاس بیل پروان چڑھی تھی تو بے جا نہ ہو گا۔ اس سلسلہ کا بہت بڑا مبلغ کبیر داس تھا۔ جس کا کہنا ہے کہ ''ہم اسی ایک اللہ سے لو لگاتے ہیں جو بے نشان ہے۔ نہ وہاں مندر کی ضرورت ہے نہ مسجد کی، وہاں وہ آپ ہی آپ موجود ہے۔ اس کی پوجا کے لیے کسی خاص رواج کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارا یہ جسم ہی مسجد ہے۔ ہمارے پانچوں حواس جماعت ہیں۔ ہمارا من ہی ملا اور امام ہے۔''

(بحوالہ دین کا قرآنی تصور از صدرالدین اصلاحی، ص:149)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ کہنے والے کا ذہن خدا پرستی کے سلسلے میں کسی واسطے اور ہادی کی ضرورت سے یکسر بیگانہ ہے اور وہ باطنی مراقبے اور ذاتی مجاہدے کو ہی حصول مقصد کے لیے کافی سمجھتا ہے، جسے وہ بطور خود اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں توحید کی راہ بھی صحیح ہے اور شرک کی بھی۔ وہ دو خداؤں کے قائل کو بھی راست روخیال کرتا ہے اور تین خداؤں کے پرستار کو بھی۔ وہ وحی و رسالت پر ایمان رکھنے والوں کو بھی صراط مستقیم پر گامزن خیال کرتا ہے اور اس کے منکروں کو بھی وہ حلول، اتحاد اور اوتار کے نظریات سے نفرت کرنے والوں کو بھی برحق مانتا ہے اور ان نظریات کے پیروؤں کو بھی۔

اسی بات کو مشہور سکھ گرو گوبند سنگھ جی نے مزید واشگاف الفاظ میں کچھ اس طرح کہا کہ ''کوئی اپنے کو منڈیا کہتا ہے، کوئی سنیاسی، کوئی یوگی، کوئی برہم چاری اور کوئی جتی، کوئی ہندو، کوئی مسلمان، یہ سب فرق جھوٹے ہیں۔ آدمی سب کی ایک ہی ذات ہے۔ سب برابر ہیں۔ سب کا ایک ہی خدا ہے۔ یہ فرق بھول اور دھوکا ہیں۔ (بحوالہ گیتا اور قرآن، ص:80) اور پھر خوب اللہ قلندری نے یہ کہہ کر بات پایۂ تکمیل تک پہنچادی کہ ''حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دنیا میں گونج رہی ہے۔ گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا''۔ (بحوالہ دین کا قرآنی تصور، ص:201)

فتنہ رواداری کا یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن اور صاحب قرآن کی بتائی ہوئی راہ کے متوازی اک اور راہ بھی اللہ تک پہنچانے والی نکلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسی راہ جس پہ چلنے والا شریعتوں، ادیان اور انبیا سے یکسر بے نیاز نظر آتا ہے اور اسی جگہ پہ اسلام اور غیر اسلام کا عظیم فرق دھندلا کر رہ جاتا ہے اور جب یہ فرق دھندلا جاتا ہے تو پھر اس بات میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی کہ مسلمان خود کو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی غیر مسلم فقیروں، جوگیوں اور گروؤں کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور مسلمان کتنے ہی غیر مسلموں کو غیر مسلم ہونے کی حالت میں ہی اپنی مریدی کا شرف عطا فرما کے ان کے قلب جاری کر دیں۔

رواداری کے نام پر قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے اور ان کی تعلیمات سے تمسخر واستہزا کی شاید اس سے گھناؤنی اور مکروہ مثال نہ مل سکے۔

اکبر اور دارا شکوہ کے بعد اگرچہ ہر دور کے دانش ور، نام نہاد صوفیا اور شعرا فتنہ رواداری کی آبیاری کرتے رہے اور اگرچہ مجاہدین وقت کی قربانی اور سرفروشی کے صدقے یہ شجر خبیثہ مطلوبہ برگ وبار نہ لا سکا مگر پھر بھی یہ سوچ تاریخی دھارے کے سنگ سفر کرتی رہی اور ہر دور کے گم کردہ راہ اس سے متاثر ہوتے رہے۔ تا آنکہ برصغیر میں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی تحریک شروع ہوگئی۔ اس تحریک میں ہنود کی مکاری حسب روایت پھر رنگ لائی اور اس بار فتنہ رواداری ''ہندو مسلم اتحاد'' کے نام سے معاشرتی چلن اور تہذیبی علامت قرار پایا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مساجد کے منبروں پر ہندو جلوہ گر ہونے لگے۔ السلام علیکم کی بجائے ''نمستے علیکم'' اور ''وعلیکم نمستے'' کی تراکیب محمود قرار پائیں، جس کی طرف مولانا ظفر علی خاں نے یوں اشارہ کیا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنا ہے کہ اک آگرہ کا مسافر
اٹھائے ہوئے سر پر ویدوں کے بستے
عراق وعجم میں یہ جا کر پکارا
نمستے علیکم علیکم نمستے

اس طویل نظم میں مولانا نے مسلمانوں کو اس ''گنگا جمنی تہذیب'' کے خطرات سے آگاہ کیا، جو رواداری کے حسین لبادے میں ان کے سامنے پیش کی جارہی تھی اور یہ وہی بہ ظاہر حسین مگر بہ باطن منافقانہ، مکارانہ اور مداہنت آمیز لبادہ تھا جس کی اوٹ سے ہندو تہذیب ہاتھ باندھ کر پرنام کرتے ہوئے پچھلی صدیوں میں اپنے ہاں آنے والی کتنی ہی تہذیبوں کو ہڑپ کر چکی تھی اور اب ایک دفعہ پھر اتحاد کے نام سے اپنے اسی سفر کا آغاز کر چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی اس تحریک کے پس منظر میں وہ مخصوص ہندو ذہنیت کام کر رہی تھی جس کا مقصد و مدعا اصل میں مسلمانوں کو ہندوستانی تہذیب میں ضم کرنا تھا، جیسا کہ پروفیسر بینی پرشاد نے لکھا ہے'' مسلمان ابھی تک اپنی انفرادی ہستی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان سے پہلے یہاں آنے والے گروہ اور قومیں ہندو معاشرے میں مدغم ہو گئے۔'' شری مودک نے کہا کہ'' مسلمان بھی دیگر اقوام کی طرح ہندوؤں کی محبت کے باعث ہندوؤں میں ضم ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا کہ ''ہندومت نے بدھ مت کو بھائیوں کی طرح بغل گیر ہو کر ختم کر دیا۔'' سوامی دیانند جی نے کہا کہ'' بھارت ویددھرم کا وطن ہے اور بھارت کو واپس ویدوں کی طرف جانا ہے اور یہاں بسنے والوں کو ویدی دھرم کے رنگ میں خود کو رنگنا ہوگا۔'' آر۔ ایس۔ ایس کے بل راج مدھوک نے اظہار افسوس کیا کہ'' ہندو قوم نے ایک ہزار سال قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بت بنا کے مسجد، مندر، منڈی، بازار وغیرہ میں کیوں نہ سجا دیا؟ مسلمان اپنے پیغمبر کو پوجنے آتے تو ان کے دلوں سے ہمارے بتوں کی نفرت بھی نکل جاتی اور وہ رفتہ رفتہ ہم میں گم ہو جاتے جس طرح بدھ مت والے ہو گئے۔ ہم نے بدھ جی کو اوتار مان لیا اور ان کا بت اپنے بتوں میں شامل کر لیا۔ ہمارے سینکڑوں ہزاروں بتوں میں ایک بت کا اضافہ ہو گیا مگر بدھ کہیں کے نہ رہے۔'' (حالاں کہ ہندوؤں نے بدھوں کو جبراً ختم کیا تھا) حتیٰ کہ گاندھی جس کو مسلمانوں نے اس تحریک کی رو میں بہتے ہوئے مسجدوں کے منبروں کی زینت بھی بنا ڈالا اور جسے ہندوؤں نے سیکولرازم اور روشن خیالی کا دیوتا قرار دیا وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اردو زبان کے حروف قرآن کے حروف سے مشترک نظر آتے ہیں لہٰذا ہندوستانی زبان اختیار کی جائے اور وہ بھی دیوناگری اکھروں میں۔ جواہر لال نہرو جو بزعم خود رواداری اور روشن خیالی انٹلکچول ہونے کے مدعی تھے انہوں نے فرمایا ''ہندوستانی ایک ہی قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ مٹھی بھر افراد کا پیدا کردہ شاخسانہ ہے۔ میں نے غور سے دیکھا ہے، میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے خوردبین لگا کر غور سے دیکھا ہے مگر دوسری قوم مجھے تو نظر نہیں آئی۔ دوسری قوم کہاں ہے؟'' یعنی مسلمانوں کے وجود کا یکسر انکار اور یہی اس تحریک کا اصل مقصد تھا۔

ایسے ماحول میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنی دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ من حیث القوم کرتے اور ہر سطح پر ہندوؤں کو یہ باور کرا دیتے کہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہاشمی'' مگر یہ اسلامیان برصغیر کا تاریخی المیہ ہے کہ بڑے بڑے صاحبان علم وفضل جن کے اسلاف کے ہاتھوں کبھی امت کی تقدیر بنی تھی۔ وہ مگر آج خود ہی تدبیر ہنود کے پابند ہو گئے، مانند نباتات وجمادات۔ جنہیں اس سیلاب کا رخ موڑنا تھا وہ مگر خود ہی بہہ گئے مانند خس وخاشاک۔ وہ جنہیں اس قافلہ بغض وعناد کو تہہ خاک سلا دینا تھا وہ خود ہی گرد کارواں ہو گئے، جن کے ذمہ روشنی کا سفر تھا وہ خود ہی اندھیروں کے شریک سفر ہو گئے اور جنہیں اس کڑے وقت میں آئمہ مجاہدین بننا تھا وہ خود ہی زیروزبر ہو گئے اور بقول اقبال ''وہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا''۔ ''بے نیازی الاماں شان تغافل الحفیظ۔ کارواں لٹتا رہا اور راہبر دیکھا کیے۔''

مگر پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں اللہ نے استقامت بخشی۔ کیوں بخشی؟ ہوسکتا ہے یہ صدقہ ہو گوالیار کے قلعہ کا یا بالاکوٹ کے میداں کا، مجاہدین 1857ء کی عزم وہمت کی داستاں کا یا علمائے حق کی قربانیوں کے نشاں کا!

بہرصورت کچھ بھی ہو یقیناً یہ لوگ اس دور کے ''مجدد'' تھے جو اپنے ہاتھوں میں دوقومی نظریہ کی تلوار تھامے امت کی بقا کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اور اگر یہ لوگ بھی بہتے پانیوں کے سنگ بہہ گئے ہوتے تو نہ جانے آج کا مورخ ہندوستان میں ایک اور اندلس کی داستاں رقم کر رہا ہوتا۔ ان فرزانوں میں ایک طرف اگر محمد علی جوہر، چوہدری رحمت علی، مولانا ظفر علی خاں، مرتضٰی احمد خاں میکش، محمد علی جناح، علامہ اقبال، سید جماعت علی شاہ اور سردار عبدالرب نشتر جیسے مخلصین کے نام آتے ہیں تو دوسری طرف علما کے سرخیل اشرف علی تھانوی کا نام بھی اک چمکتا سورج ہے، جنہیں اس دور کے علما کے شہر غفلت میں اذان فجر کہنے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے نزدیک رواداری کے پردے میں ہندو مسلم اتحاد جسد امت کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہ تھا۔ اسی لیے یہ فرد جلیل اپنی تمام تر علمی وجاہت کے باوجود ہندو مسلم اتحاد پر لعنت بھیجنے پہ مجبور ہو گیا۔ انہوں نے لکھا ''آج کل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور کہتے ہیں یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے۔ مگر ان کا اتحاد یک طرفہ ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا سی رعایت بھی نہیں کرتے جہاں اس کو موقعہ ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد بنا لیتے ہیں مگر ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ چاہے ایمان جاتا رہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے۔'' (بحوالہ اشرف الجواب، ص، 445 تا 454، ملخصاً)

اللہ کے فضل وکرم اور ایسے ہی لوگوں کی قربانی اور ہمت نے ایک دفعہ پھر فتنہ رواداری کو چاروں شانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چت کردیا۔ اور 14 اگست 1947ء کا سورج مسلمانان برصغیر کے لیے یہ پیغام لے کر طلوع ہوا کہ دیکھو! اگر روا داری بے غیرتی، بزدلی، کم ہمتی، امت سے بے نیازی، محض دوسروں کی خوشی اور خود کو روادار و روشن خیال کہلانے کے لیے اپنے موقف سے دستبرداری کا نام ہوتا تو تمہیں آج کا دن اس شکل میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

بلا شبہ مسلمانان پاکستان اپنے لاکھوں لاشوں کے ساتھ رواداری کے اس مفہوم کو بھی واہگہ پار دفن کر آئے تھے مگر ہمارے تسامح اور تساہل نے پھر کام کر دکھایا کہ ہماری قربانیوں کو ابھی نصف صدی بھی نہیں ہونے پائی کہ آج ایک دفعہ پھر یہ نظر آ رہا ہے کہ وہی اکبر، داراشکوہ اور کانگریسی سوچ ہماری معاشرتی رگوں میں پھر سرایت کر رہی ہے۔ آج یہ سوچ یہ نعرہ لگا کر آگے بڑھ رہی ہے کہ ہم بنیاد پرست نہیں۔ پاکستان سیکولرازم کے لیے بنا تھا، اسلام کے لیے نہیں۔ ایسا سیکولرازم جس میں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کی محبوب شخصیات پر کیچڑ اچھالنے کا پورا حق حاصل ہو۔ سارے راستے خدا کی طرف جاتے ہیں۔ مذاہب کی حدود و قیود انسانوں کی آزادی پر قدغن ہیں اور یہ عقل انسانی پہ جمود طاری کرتی ہیں۔ ایسی ہی بہت سی باتیں، بہت سے نعرے جن کے نام حسب موقع اور حسب حال بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی انہیں آزادی، امن اور جمہوریت کہا جاتا ہے تو کبھی حقوق نسواں، اظہار رائے کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے اور اگر کوئی جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے رواداری کا درس کچھ ایسے زور و شور سے دیا جاتا ہے کہ جیسے اسلام کا غیرت وحمیت سے کچھ بھی تعلق نہیں اور بعض اوقات اس منافقانہ مہم کا شکار مخلص مسلمان بھی ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ان کے ہم آواز ہو کر علم برداران حمیت سے پوچھتے ہیں کہ آپ ان کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ کیا اسلام رواداری کی تلقین نہیں کرتا؟ انہیں ہم ہاتھ باندھ کر یہ کہہ سکتے ہیں یا اخوان الکرام بے شک اسلام رواداری کا پرچارک ہے مگر یہ رواداری نہیں بلکہ رواداری کے نام پہ آپ سے غیرت وحمیت کا جوہر ختم کرنا ہے اور اسے ہی ہم فتنہ رواداری کہتے ہیں اور اسی کی نقاب کشائی کی یہ کوشش ہے، جس طرح اکبر کے دور میں رواداری کے نام پر دین اکبری کا مقصد مسلم قومیت کو ہندو وطنیت کے جوہڑ میں غرق کرنا اور آزادی مسلم کو روکنا تھا اسی طرح آج کے ''اکبروں'' کا مقصد اسلامی تہذیب پہ یورپی تہذیب کو غالب کرنا، ہندو ثقافت کو عام کرنا، ہندو قوم کو تجارت وتعلقات کے لیے ''فیورٹ نیشن'' بنانا اور امریکی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالنا ہے۔ ان کے نزدیک رواداری اس چیز اور صورت حال کا نام ہے کہ اسلام مانند آب ہو جائے، جس برتن میں ڈالیں اسی کی شکل اختیار کر جائے، یعنی نام تو ہو اسلام کا اور شکل ان کی من پسند (یہ پہلا مرحلہ ہے، اگلے مرحلہ میں انہیں اسلام کا نام بھی روا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

داری کیخلاف نظر آئے گا) لیکن انہیں کیا خبر کہ اسلام تو اک ٹھوس حقیقت ہے اس کا اپنا رنگ، اپنی شکل اور اپنا ذائقہ ہے۔

رواداری اس چیز کا نام نہیں کہ اسلام ان کی مرضی کے مطابق ہر سانچے میں ڈھل جائے بلکہ یہ تو دوسروں کی بہتری اور فوز وفلاح کے لیے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ سب اس کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔ یہ اگرچہ غیروں کو اپنے اندر سمونے کی تمنا رکھتا ہے اور ترغیب ودعوت بھی دیتا ہے، کوئی تسلیم کر لے تو بہت اچھا نہ تسلیم کرے تو زبردستی اور جبر واکراہ نہیں کرتا۔ انہیں ان کی مرضی، خواہشات کے احترام اور عدل وانصاف کے سائے تلے جینے کا پورا حق دیتا ہے اور یہی اسلام کی رواداری ہے۔ ہاں! مگر اتنی احتیاط اور پرہیز ضرور کرتا ہے کہ کفر وشرک کی نجاست اور باطل کی خباثت، اس کے اجلے دامن کو پراگندہ نہ کرنے پائے اور احتیاط وپرہیز کا یہی عمل فتنہ رواداری کے بانیوں اور حامیوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اور ہمیں یہاں یہی کہنا ہے کہ یہ اگر کھٹکتا ہے تو کھٹکنے دیجیے اور اس میں ذرہ بھر رواداری اور تساہل سے کام نہ لیجیے گا کیوں کہ اگر خدانخواستہ یہ بزعم خود روشن خیال آپ پہ حاوی ہو گئے تو یقین کیجیے کہ یہ ایک لمحے کو بھی آپ سے رواداری برتنے کو تیار نہ ہوں گے۔ تاریخی تجربہ اسی پر دلالت کرتا ہے اور ہاں! یاد رکھیے کہ حق کے حق ہونے کی علامت بھی یہی ہے کہ باطل کی نگاہوں میں خار بن کے کھٹکتا رہے۔

فتنہ رواداری کے چاہنے والے آج بڑی سرگرمی سے اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ دل مسلم سے دینی غیرت وحمیت کا خانہ خالی کر کے صرف رواداری بمعنی بزدلی وکم ہمتی کو وہاں براجمان کر دیا جائے اور جہاں کہیں سے بھی امت کے احیا، ملی اقتدار کی بقا، اسلامی تشخص کی ضیا، دینی غیرت کی فضا اور انقلاب مصطفیٰ کی آواز بلند ہو، اسے نہ صرف دبا دیا جائے بلکہ یہ کہہ کر اسے فنا کر دیا جائے کہ اسلام تو بس رواداری کا دین ہے، فرد سے لے کر معاشرے تک، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور شخصی کاوش سے لے کر پوری تحریک تک جہاں کہیں کسی نے جب بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی، تو اسے یہی کہہ کر روکا گیا کہ آخر تم کفر وباطل کو، ظلم وستم، شرک وبدعت کو، ارتداد والحاد کو برداشت کیوں نہیں کرتے کہ اسلام تو تمہیں رواداری سکھلاتا ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑے، بس ہونٹوں کو سی لو کہ رواداری ہے، خاک ارضی خون مسلم سے رنگین ہو جائے، بس چپ رہ کے جی لو کہ رواداری ہے۔ جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچاؤ کہ رواداری ہے اور توہین صحابہؓ ہو، نہ شور مچاؤ کہ رواداری ہے لیکن عجب بلکہ منافقت تو یہ ہے کہ رواداری کے اس مفہوم سے خود اس کا پرچار کرنے والوں کی زندگی خالی ہے۔ منشیات کے دھندے پر موت کی سزا ہو تو سب ٹھیک، لیکن گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سزائے موت کا قانون بنے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آسمان سر پر اٹھائیں کہ رواداری ہے، اپنے گھر میں نقب زنی ہو تو چور کو زندہ بھی جلا دیں تو کوئی بات نہیں، ویسے جو چور کا ہاتھ کاٹنے کی بات ہو تو چیخیں اور چلائیں کہ رواداری ہے۔ جو گھر میں زنا ہو جائے تو چاہیں کہ زانی کی نسلیں بھی سزا بھگتیں مگر زنا پہ سنگساری کی بات ہو تو آنسو بہائیں کہ رواداری ہے۔ غیرت دینی میں نوجوان کسی مندر کی اینٹ بھی کھسکا دیں تو واویلا اور غیر چاہے بابری مسجد گرائیں کہ رواداری ہے۔ ادھر لاکھوں انسان قحط سے مر جائیں اور ادھر گندم سمندر میں بہائیں کہ رواداری ہے۔ کویت پر قبضہ ہو تو عراق کو کھنڈر بنائیں، کشمیر و بوسنیا کی بات ہو تو فرمائیں کہ رواداری ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر پوری دنیا میں دہشت گردی ہو تو خاموشی اور زبان مسلم پہ نام جہاد بھی آجائے تو فوراً بتلائیں کہ رواداری ہے۔

غیر تو غیر ہی ہوتے ہیں، ان سے بھلائی کی امید کہاں؟ لیکن دل تو جلتا ہے کہ جب اپنے بھی ستم میں شامل ہو جائیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

ان اپنوں کی یہ بے پناہ ''اپنائیت'' ہی ان سطور کے ظہور کا باعث بنی، تاکہ بہانگ دہل اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ اگرچہ رواداری اسلام کا طرۂ امتیاز ہے مگر جو رواداری مسلمان کے لیے ہے، وہ کافر کے لیے نہیں، جو کافر کے لیے ہے، وہ مرتد کے لیے نہیں اور جو مرتد کے لیے ہے، وہ زندیق کے لیے نہیں۔ جیسا کہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے لکھا کہ اسلام میں جہاں تلوار کا بے جا استعمال ظلم ہے وہاں ظالم کے خلاف تلوار کا استعمال نہ کرنا بھی جرم ہے۔ یہاں کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ دینی غیرت وحمیت کی صفت کو اسلام نے آزاد چھوڑ دیا ہے، جو چاہے، جہاں چاہے اس کا اظہار کرے، نہیں بلکہ یہ صفت محبوب بھی جونہی اپنی سرحدیں عبور کرتے ہوئے تعصب وجاہلیت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے آگے بھی اسلام حدود وقیود کی دیوار چن دیتا ہے کیوں کہ اسلام میں کہیں اور کسی بھی حالت میں ناانصافی، ظلم وزیادتی اور ذاتی انا کی تسکین جائز نہیں۔ عفو ودرگزر اور رواداری ہو تو وہ بھی اللہ کے لیے اور مقام غیرت پہ غیرت کا اظہار ہو تو وہ بھی اللہ کے لیے۔ یہی وہ باریک سرحد اور حد فاصل ہے جس کا جاننا ازحد ضروری ہے اور یہ علم ہونے کے بعد ہی یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ رواداری کہاں تک ہے اور بے غیرتی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ غیرت کی صفت کہاں تک جائز اور جاہلیت کہاں سے شروع ہوتی ہے!

☆☆..........☆☆

© rasailojaraid.com